بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

میں نے اپنے عزیز ساتھی کی ساری باتیں سنیں، اور پھر اُس سے کہا:-

عزیز من! آپ میں یہ احساس کیوں پیدا ہوا کہ آپ کے پاس کوئی کام نہیں؟ حق و انصاف کی گواہی دینے والے خدا کے سپاہیوں پر کبھی کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ اُن کے پاس کوئی کام نہ رہے، وہ فارغ ہوں اور پریشان ہونے لگیں۔

آپ اس انتظار میں رہنے کے عادی ہوگئے ہیں کہ کوئی دوسرا آکسائے اور چونکائے۔ کوئی منت سماجت کرے یا زجر و توبیخ سے کام لے۔ آپ سے کام لینے والا آپ کے اپنے اندر کیوں نہیں ہے؟ آپ کا ایمان آپ کو نشتر کیوں نہیں چبھوتا اور آپ کا وعدہ و میثاق آپ کو بار بار کیوں نہیں جھنجھوڑتا؟

آپ اپنا رُوئے سخن خدا کی طرف کر کے اس سے کیوں نہیں پوچھتے کہ میرے لیے کیا کام ہے؟ آپ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی محفل آراستہ کر کے وہاں کیوں سوال نہیں کرتے کہ میری راہِ عمل کدھر جاتی ہے؟ سیرت و سوانح کا نورانی دفتر موجود ہے اس سے معلوم کیجیے کہ ایک مسلم کیا کرے؟

خرابی یہ ہے کہ دین کا کام ابھی تک آپ کا ذاتی کام نہیں بنا۔ اس ذاتی کام، اصل دلچسپیاں، اصل سرگرمیاں، اصل رشتے رابطے دوسرے ہیں۔ دین کو آپ کسی دوسری قوت کی طرف سے عاید شدہ کام سمجھتے ہیں۔

حالانکہ آپ نے خدا کے ہاں مزدوری کرنے والے محنت کاروں میں نام لکھوایا اور خدا کی

فوج میں آپ سپاہی بھرتی ہوئے ہیں۔ ایک مزدور خوب جانتا ہے کہ اسے مالک کے کارخانے یا باغ یا کھیت میں کیا کام کرنا ہے، اسی طرح ایک سپاہی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کن طاقتوں سے جنگ ہے اور وہ کہاں کہاں ہیں، کدھر کدھر سے کیا حملہ کر رہی ہیں اور ان کا مقابلہ کس کس محاذ سے کیسے کیسے کرنا ہے۔ آپ دوسروں کی طرف سے تجویزوں کا انتظار کرتے ہیں، آپ خود کیوں نت نئی مفید تجویزیں نہیں سوچتے؟ آپ بنے بنائے منصوبے مانگتے ہیں۔ آخر خود کیوں منصوبے تیار نہیں کرتے۔

عزیز بھائی! مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسا صاحب علم و فکر اور مالک خلق و کردار قائد آپ سے جدا ہو گیا ہے اور یقیناً اس کا صدمہ ہونا چاہیے۔ لیکن آپ کی باتوں سے ایسا تأثر جھلکتا ہے گویا کہ بات ختم ہو گئی۔ اب ویسا کوئی نہیں آئے گا اور ویسا نہیں ہوگا تو پھر کام کیسے ہو سکتا ہے۔

مولینا مودودی پر ایسی موت وارد نہیں ہوئی ہے کہ اُن کی فکر اور اُن کی تحریک اُن کے نظر سے اوجھل ہوتے ہی ہوا میں اُڑ جائیں۔ وہ نہیں رہے تو بھی اُن کا قائدانہ فیض ہم میں جاری ہے۔ اور پھر شریعت کے جس تصور قیادت سے انہوں نے ہمیں آشنا کیا ہے اس کے لحاظ سے اگر کوئی شخص نیت کا مخلص، دین کے مقاصد کو جاننے والا اور ہم سفروں کی مرضی اور ہم سفروں کے مشورے کے ساتھ قافلے کو لے چلنے والا ایسا مل سکے جسے ہم اپنے اندر بہتر پاتے ہوں تو پھر اس کا احترام کیا جائے گا، اس کی اطاعت کی جائے گی، اور اس کو اس کمزور کن احساس میں پڑنے نہیں دیا جائے گا کہ وہ چونکہ مولینا مودودیؒ نہیں ہے اس وجہ سے وہ کام نہیں چلا سکتا۔ ہمیں اسے یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے معزز منصب کی وجہ سے تم بھی ہمیں ویسے ہی عزیز ہو، تم بھی ہماری بزم میں ایسے ہی فانوس روشن ہو اور ہم تمہارے ایک ایک اشارے پر اسی طرح چلیں گے جس طرح مولینا مودودیؒ کے دور میں ہوتا رہا ہے چاہے اس کی علمی سطح کمتر ہو، چاہے اس کی بعض آرا مختلف بھی ہوں چاہے اس کا اسلوب کار کسی قدر جداگانہ انداز رکھتا ہو، چاہے اس کا مزاج مختلف ہو۔ ہم صرف یہ چاہیں گے کہ ہمیں معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے اور تمام معاملات مشوروں سے

انجام پائیں۔ تمام لوگوں کو مقررہ دستوری اسالیب سے بات کرنے کا، اختلافات کرنے کا اور تنقید و محاسبہ کرنے کا حق حاصل رہے۔ یہ سب کچھ اگر حاصل رہے تو سمجھو کہ مولانا مودودیؒ کی قیادت جاری ہے۔

اجتماعیت کی ایک شرط اسلام میں یہ ہے کہ اگر دینی مقاصد کے لیے نظام مشاورت کے ساتھ کام چلایا جا رہا ہو تو آپ اجتماعیت کے مقررہ اداروں یا مناصب سے تو ہر خطاب کر سکتے ہیں، مگر متفرق محفلوں میں آپ اجتماعیت کے فیصلوں پر منفی یا تنقیدی رائیں نہیں دے سکتے۔ ورنہ نجویٰ کا راستہ کھول دینے کے بعد کوئی اجتماعیت صحت مندانہ خطوط پر نہیں چل سکتی۔ براہ کرم کبھی بھی نجویٰ کے طرز پر غلط جگہوں پر باتیں نہ کریں۔ ورنہ آپ کا جذبۂ اخلاص تباہ ہو جائے گا۔

لیکن آج بڑی مشکل یہ ہے کہ سرے سے اجتماعیت کا ڈھانچہ توڑ دیا گیا ہے اور فرد فرد بکھر گیا ہے۔ اس تبدیلی کا ایک تجربہ ہمیں پہلے ہو چکا ہے کہ ہم نے تنہا رہ کر اپنے جذبۂ ایمانی کے چراغوں کو روشن رکھنے کے ساتھ معاشرے میں نفوذ کر کے دعوتِ حق پہنچانے کے نت نئے راستے نکالے ہیں۔ آج کوئی انوکھی آزمائش درپیش نہیں۔ اس وقت ہر فرد کو ایک امت بن کر کام کرنا ہے۔

ایسے مرحلۂ آزمائش میں سب سے زیادہ خطرہ یہ ہوتا ہے کہ افراد اگر پہلے سے باشعور اور تربیت یافتہ نہ ہوں تو الگ الگ بولیاں بولنے لگتے ہیں اور طرح طرح کے اختلاف رونما ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے حضورؐ نے انتباہ دیا تھا کہ اجتماعیت سے محروم آدمی تو ریوڑ سے کٹی ہوئی ایک بکری کی طرح ہے جسے گرگ طینت شیطان لقمہ بنا لیتا ہے۔ مگر دین تو اس لیے بھی ہے کہ بکریوں کو اتنی شیری سکھا دے کہ اگر کبھی ریوڑ رہے بھی نہیں تو تنہا بکری بھی اپنی حفاظت کر سکے۔

ایسے دورِ خلا میں ایک خطرہ اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ آدمی نے جن دلچسپیوں کو چھوڑ دیا تھا، جس سلسلۂ مفاد سے انقطاع کر لیا تھا، جن غیر ضروری تعلقات کو فراموش کر دیا تھا، وہ چاروں طرف سے اُمڈ آتے ہیں۔ دولت کمانے کا جنون، جائیدادیں بنانے کے پروگرام، بیوی بچوں کی دبی ہوئی دلچسپیاں اور قبیلہ و خاندان کے ناقابلِ تبدیل رواج سب اپنا اپنا دباؤ ڈالتے ہیں، یہاں تک کہ ایک مردِ حق

ان میں پوری طرح منہمک ہو جاتا ہے۔ نہ اُس کے پاس وقت رہتا ہے، نہ حقیقی لگن باقی رہتی ہے اور اپنی اس زوال پذیر حالت پر ضمیر کو مطمئن رکھنے کے لیے وہ پکارتا ہے کہ کوئی بتائے کہ مجھے کیا کام کرنا چاہیے۔

عزیز من اگر نماز روزہ کی ادائی کے لیے کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا تو آخر دعوتِ حق کو خدا کے بندوں تک پہنچانے، خدمت کے کام کرنے، لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے، دینی و ملّی مقاصد کی طرف عوام کو توجہ دلانے کے کاموں میں کسی سے دریافت کرنا کیا ضروری ہے؟ نماز با جماعت ادا کرنے پہ اگر کہیں پابندی ہے تو اپنی اپنی انفرادی نماز پر تو کوئی قدغن نہیں!

عزیز من! میں نے تمہیں اپنوں اور بیگانوں کے درمیان بیٹھ کر مایوسی پھیلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرے شعور کے مطابق یہ بہت بڑا جرم ہے کہ لوگوں کو دین، دعوتِ دین، اسلامی تحریک، اسلامی شخصیتوں یا اسلامی اداروں کے متعلق مایوس کیا جائے، یا کسی بھی ایسی تنظیم (موجودہ یا سابق) کے متعلق بدظن کیا جائے جس نے انہیں توانائی بخشی ہو۔

مسلط شدہ باطل نظاموں اور غیر اسلامی حکومتوں کے خلاف اُٹھنے والے کمزور اور قلیل التعداد اور بے سروسامان لوگوں کا سرمایہ کار ہی ایمان و امید ہوتا ہے۔ ایمان و امید ہی کی برکت سے اُن کی تعداد بڑھتی ہے۔ ان میں قوت آتی ہے، وہ شدائد کا مقابلہ کرتے ہیں، وہ جدوجہد کی طویل ہوتی ہوئی راہوں پر صبر سے مارچ کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخر وہ کامیابی تک پہنچتے ہیں۔ ایمان یا امید کی قوت کو اگر کمزور کر دیا جائے تو دین کا سارا کام خراب ہو کے رہ جائے گا۔

لوگوں کو دین کے متعلق یہ امید رہنی چاہیے کہ یہ غالب ہو سکتا ہے بلکہ ضرور ہو گا۔ پھر جس شخص یا جماعت نے دین کے متعلق اُن کی اُمیدیں استوار کی ہیں، اس کے ساتھ بھی اُن کی اُمیدوں کو وابستہ رہنا چاہیے کہ یہ قوت ہمیں کامیابی کی طرف لے جا سکتی ہے اور لے جا رہی ہے۔ کسی جماعت کے ساتھ اُمیدیں اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہیں کہ اُس کی قیادت کو مطعون و معتوب نہ کیا جائے (ماسوا اس کے کہ مخصوص وجوہ موجود ہوں اور اپنی آواز مقررہ تنظیمی راستے سے اُٹھائی جائے اور ضرورت ہو تو قیادت کو بدل دیا جائے)۔

لیکن آج جس جماعت کا نظم موجود ہی نہیں، اس کے بکھرے ہوئے ارکان میں تو مصیبت زدگی کا احساس ہونا چاہیے۔ جیسے کسی بستی میں زلزلہ آگیا ہو، مکان گر گئے ہوں اور لوگ پراگندہ ہو گئے ہوں۔ ایسے نظم کے لیڈر، دانشور، ارکان، کارکن، ہمدرد اور متفق سب کے سب مصیبت زدہ ہیں۔ ان میں باہم صرف ہمدردی و دلسوزی کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے پر اعتراض اُٹھانے اور ایک دوسرے کے متعلق مایوسی کا اظہار کرنے کا یہ کونسا موقع ہے، جو لوگ دوسروں سے مایوسی کا آغاز کرتے ہیں اُن کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے مایوس ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ سے مایوسی جدوجہد کی اس دُنیا میں ایک طرح کی خودکشی ہے۔

وہ کرب جو ایک معطل شدہ دینی جماعت کا کارکن محسوس کرتا ہے کہ اب اُسے کہیں سے رہنمائی نہیں مل رہی ہے، اس کے مقابلے میں سابق اہل قیادت کا کرب دسیوں گنا زیادہ ہے جو یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ جس بھاری بھرکم مشینری کو چلانے کے وہ ذمہ دار تھے۔ اُسے اُن کے سامنے سے غائب کر دیا گیا اور اس کے تمام پرزے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب خود ان اکابر میں سے بھی ہر فرد کسی عام کارکن کی طرح ایک فرد تنہا بن کر رہ گیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کارکنان کو ذاتی کرب سے بڑھ کر اپنے سابق اہل قیادت کے بھاری اور وسیع کرب کو محسوس کرنا چاہیے اور اُن کے لیے انتہائی دلسوزی ان میں کارفرما ہونی چاہیے۔

اس حالت میں تو صورتِ تلافی ایک ہی ہے کہ ہر فرد تنہا ہو کر بھی پہلے سے زیادہ ایمان، پہلے سے زیادہ اُمید کے ساتھ اور پہلے سے زیادہ سرگرمی سے کام کرے تاکہ جب کبھی حالات اپنی جگہ پر واپس ہوں تو ہر ایک یہ محسوس کرے کہ اس غیر تنظیمی دور میں ہم نے ذہن اور کردار اور ماحول پر اثراندازی کے لحاظ سے بہت اچھی نشوونما پائی ہے، اور ہم پہلے سے زیادہ بڑی قوت بن چکے ہیں۔

عزیزمن! تم اگر خدا سے باندھے ہوئے میثاق پر قائم ہو تو چاہیے تھا کہ وقت نکال کر گھر سے دعوتِ حق کا عَلَم اُٹھا کر نکل کھڑے ہوتے، محلے کے ایک ایک دروازے پر دستک دیتے، خاندان کے ایک ایک فرد سے ملتے، خاص خاص تعلقات کے دائروں میں پہنچتے، دیہات کو روانہ ہو جاتے، ہسپتالوں اور جیلوں کے مصیبت زدگان تک پہنچتے، مسجدوں کے حلقہ ہائے درس اور دائرہ ہائے ذکر و فکر میں

شامل ہوتے، ادب کی محفلوں میں بیٹھتے، چوپالوں میں جا جا کر قلوبِ زندہ کی تلاش کرتے، درس گاہوں میں پہنچ کر طلبہ کی نوخیز روحوں تک خدا اور رسولؐ کی تعلیم کی خوشبو پہنچاتے۔ مہاجرینِ افغانستان کے لیے چندہ جمع کرنے پر ہر روز کچھ وقت صرف کرتے، لوگوں کو افغانستان میں رُوسی جارحیت کا حال بتاتے اور انھیں اشتراکیت کے انسانیت کش فلسفے اور اُس کی خونم خون تاریخ کے اوراق دکھاتے، روس والوں نے وسطِ ایشیا کی جن ریاستوں کو پہلے کئی سال تک مسلمانوں کی مزاحمت کو کچلنے کے بعد تسخیر بنایا ہے ان کا دکھڑا بیان کرتے، جبرِ الحاد کی بھاری چٹان کے نیچے جس طرح اسلامی عقیدوں اور روایتوں کی راسخ ویل کو دبا دیا گیا۔ اس کی داستان عام کرتے۔ تم لوگوں میں اسلامی جذبۂ جہاد کو بیدار کرنے کے لیے مارے مارے پھرتے۔ اور نہیں تو گھر پر درسِ قرآن کا مختصر سا حلقہ شروع کر دیتے، بچوں کو قرآنِ ناظرہ پڑھاتے اور نماز سکھانے کا انتظام کرتے۔ عورتوں کے لیے سلائی کڑھائی کی تربیت کا معیاری نہیں تو غیر رسمی مرکز اہلِ خانہ کے تعاون سے کھلوا لیتے۔ اپنی بیٹھک پر اَن پڑھ عوام کے لیے دفتری کاموں سے متعلق درخواستیں لکھ کر دینے کا انتظام کرتے، محلے والوں سے رابطہ بڑھا کر ایک فلاح کمیٹی قائم کر لیتے اور اس کے زیرِ انتظام نوجوانوں کو کم سے کم ہفتے میں ایک بار جمع کر کے محلے میں اور خصوصاً شہر کی مسجد میں صفائی کی مہم چلاتے، مریضوں کو ہسپتالوں میں اور طلبہ کو درسگاہوں میں داخل دلوانے کے لیے سعی کرتے۔ ان کاموں کے ساتھ ساتھ دینی دعوت کا سلسلہ از خود جاری رہتا۔ ان راستوں پر چلتے ہوتے نئے نئے ساتھی اُٹھ کھڑے ہوتے اور ایک محدود سی سماجی اجتماعیت کا حلقہ بن جاتا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے ہزاروں حلقے ملک کے شہروں اور دیہات میں اُبھر آتے اور اُن کی دعوتی سرگرمی کی زد سے کوئی شہری محفوظ نہ رہ سکتا۔

مگر عزیزم! تم اس بات کے عادی ہو گئے ہو کہ لکھے لکھائے پمفلٹ آ جائیں تو اِدھر اُدھر چند لوگوں کو تھما دو، یا پوسٹر تیار ہو کر از خود سامنے آ جائیں تو انھیں دیواروں پر چسپاں کرا دو، یا ماحول کے جائزے اور کارکردگی کی کوئی رپورٹ دفتر یا گھر میں بیٹھ کر خوش اسلوبی سے مرتب کر دکھاؤ، کوئی مامور شدہ ذمہ دار آ جائے تو اس کے ساتھ باتیں ہو جائیں اور کسی محفل آرائی کی ضرورت ہو تو اس کا بندوبست کر لیا جائے۔

سچا داعی تو وہ ہوتا ہے جس کے اپنے اندر پمفلٹ بھی موجود رہتے ہیں اور پوسٹر بھی، وہ خود

اپنے آپ کو ڈیوٹی پر مامور اور ذمہ دار سمجھتا ہے، وہ ہر روز اپنی رپورٹ اپنے ضمیر کے واسطے سے خدا تک پہنچاتا ہے۔ اور وہ اپنی محفل خود آراستہ کر لیتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں وہ کام کرنے کی راہیں خود ایجاد کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خود ہی اکساتا ہے اور از خود حرکت کرتا ہے۔ اصول اور مقاصد متعین ہیں، دین کا مطمانہ انداز کار بھی واضح ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو حق کا شعور دلانا ہے۔ دینی لٹریچر کا ایک ذخیرہ بصیرت کی روشنی پانے کے لیے موجود ہے، ہر قسم کے حالات میں کام کرنے کے مختلف تجربوں کا سرمایہ ساتھ ہے، مخالف نظریات اور اداروں اور تحریکوں سے تعارف حاصل ہے، فتنوں کا اندازہ ہے تو پھر ایک سچے داعی کو اگر اسکیمو لینڈ میں بھی اتار دیا جائے تو وہ کام کرنے کا راستہ نکال لے گا۔

ضرورت باہر سے کسی چیز کی اتنی نہیں ہے، جتنی اندرون کو زندہ و منور کرنے کی ہے۔

رفیقِ عزیز! کہیں ایسا تو نہیں کہ خود تمہاری شخصیت کے شاخسار میں ناکارگی اور سہل انگاری نے آشیانے بنا لیے ہوں، خود تمہارے اندر جذبۂ بیتاب موجود نہ ہو، خود تمہارا ایمان تمہیں پوری طرح روشنی نہ دیتا ہو، خود تمہارا ضمیر افیون خوردہ ہو، خود تم نے زندگی میں بہت سے نمایاں قسم کے تضاد پال لیے ہوں اور ہر قسم کے حالات اور عناصر کے ساتھ تم نے سمجھوتے کر لیے ہوں؟

تمہارا حال اگر خدانخواستہ اس پیراک کا سا ہو جس نے جسم کے ساتھ بھاری پتھر باندھ رکھے ہوں اور ہاتھوں اور پیروں کو زنجیروں سے جکڑ رکھا ہو تو پھر کوئی مودودیؒ، کوئی سید قطبؒ اور کوئی خمینی یا کوئی نظام جماعت تمہیں ڈوبنے سے بچا نہیں سکتا۔ لیکن ستم ظریفی ہو گی، اگر تم نیچے ہی نیچے جاتے ہوئے اپنی تدریجی غرقابی کا الزام دوسروں پر رکھو۔

قومیں اور تحریکیں اور جماعتیں وہی کامیاب ہوتی ہیں جن کا ہر فرد سب سے پہلے اپنی جگہ یہ سوچتا ہے کہ میرا فرض کیا ہے، اور آیا میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں؟ مجھے انقلابِ فردا کے لیے اپنا جو حصہ ادا کرنا ہے وہ دیانت داری سے ادا کر رہا ہوں؟ جہاں فرد فرد کے اندر ذاتی ذمہ داری کا یہ احساس موجود ہوتا ہے، وہاں یہ ضرورت نہیں پڑتی کہ آدمی اپنی کوتاہیوں کا بوجھ اٹھا اٹھا کر دوسروں پر ڈالے اور اس تلاش میں رہے کہ کس کس پر کتنا کتنا یہ بوجھ ڈالا جا سکتا ہے۔ (باقی بر صفحہ ۷۶)

(بقیہ اشارات)

براہ کرم اپنا پورا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھانے کی کوشش کیجیے۔

رفیقِ عزیز! کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے اندر کچھ ہم سفروں کے لیے کینہ و کد کا مخفی اڈا ہو۔ اور انہیں سامنے رکھ کر ایسے موضوعات ڈھونڈو، ایسی بحثیں چھیڑو اور ایسے مصرعے اُٹھاؤ، جن کی زد اُن پر پڑ سکتی ہو؟

کہیں تمہارے اندر کچھ افراد کے لیے انتقامی رجحانات کی لہریں تو نہیں اُٹھتیں کہ جن کے تھپیڑے اُن افراد ہی کو نہ لگتے ہوں بلکہ سا منے سامنے دین کی دعوتی سرگرمیوں کو بھی تلپٹ کر دینے والے ہوں۔

کہیں تمہارے اندر ایسی کدورتیں اور بیزاریاں تو موجود نہیں ہیں جن کی وجہ سے جو کچھ کام ہو رہا ہو، اُسے بھی نقصان پہنچتا ہو۔ اور ایک چھپی ہوئی بیماری دل کی چھوت آہستہ آہستہ دوسروں کو بھی لگتی رہتی ہو۔

کدورتوں اور بیزاریوں کا حساب ایسے دوستوں کی فہرست مرتب کر کے لگایا جاسکتا ہے جن کے قریب جانے اور ربط و ضبط رکھنے اور جن کے لیے کلمۂ خیر کہنے سے آدمی اجتناب کرتا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے سر میں کچھ بننے اور آگے بڑھنے اور بڑھ کر کچھ پا لینے اور بنا لینے کا سودا موجود ہو۔ کچھ شہرت کا لپکا، کچھ پبلسٹی کا چسکا، کچھ کیمرے کی چشم بلوریں کی مسحوریت، کچھ اپنے لیے مقام اعتبار (PROJECTION) حاصل کرنے کا جنون اور کچھ اپنا نقش (IMMAGE) اجاگر کرنے کا خبط۔ یہ سب آسیب ہیں۔ کہیں یہ آسیب تو سایہ نہیں ڈال رہے۔ بظاہر ان محرکات کے تحت آدمی فوت سے بڑھ کر تگ و تاز کرتا ہے مگر اصلی مقصد کے لحاظ سے کوئی خاص مؤثر پیشقدمی نہیں ہوتی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ جہاں کہیں کوئی مخالف مل جائے اس پر تمہیں پیار آتا ہو اور ایسے لوگوں کے ٹیڑھے نظریات سے فوراً ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہو۔ یہ بھی غلط عوامل کا نکاس ہے۔

پیارے ساتھی! ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر اپنا ذہنی تجزیہ خود کرو۔ اور اپنی نیت کے چشمے کو گدلا کرنے والی ہر چیز کو باہر نکال پھینکو۔ یہی راہ فلاح ہے۔ کیوں اپنے آپ کو خراب

کرتے ہو، اور اپنے ساتھی دوسروں کو مشکلات میں ڈالتے ہو۔

کدورتیں اور نفرتیں اور مخفی انتقامی جذبے ذہن کی کمین گاہوں میں چھپ کر وار کرنے والے رہزن ہیں۔ یہ منفی قوتیں اسلام کے کسی سپاہی کے لیے سخت ضرر رساں ہیں۔ ان کی وجہ سے اصل دعوت اور اصل مقصد کو جو نقصان پہنچتا ہے اور خدا کی راہ میں محنتیں کھپانے والے اچھے بھلے سپاہیانِ حق کے اندر جو اضطراب اور انتشار پیدا ہوتا ہے، آخرت میں اس کا حساب کتاب ہونا ہے۔ آج خود ہی آڈٹ کر کے دیکھ لو کہ تمھارے حساب کتاب کے اس کھاتے کی میزان درست ہے؟

یہاں تو آدمی اپنے رویوں کا ذہنی و جذباتی پس منظر چھپا سکتا ہے، خوب صورت تاویلیں کر سکتا ہے، پُرزور دلائل دے سکتا ہے، بہترین لفاظی کر سکتا ہے، مگر آخرت پر ایمان رکھنے والوں کو تو اپنے مرعوب کن دلائل اور خوش نما تاویلوں کے پس منظر میں کام کرنے والے مخفی عوامل کو اچھی طرح شناخت کر لینا چاہیے، اور اس کا اندازہ بھی کر لینا چاہیے کہ وہاں کی عدالت میں اعمال کے عیاں اور پنہاں پہلوؤں کو واضح کر کے کیسی جرح کی جائے گی۔ اور کیا اُس جرح کا سامنا کیا جا سکے گا؟

دیکھو کہ جس خطۂ زمین کو تم نے مسجد کی مانند قرار دیا تھا، کیونکہ یہ اسلامی نظام کے لیے وقف ہو چکی ہے، اُس کے گرد خطرات منڈلا رہے ہیں، اور اس کے اندر سیاسی گھٹن کے علاوہ اخلاقی بحران پھیلا ہوا ہے۔ دولت پرستی، زرِحرام کی چاٹ، رشوت، خیانت، قانون شکنی، کام چوری، کمزوروں پر ظلم، مجبوروں کا استحصال، ڈاکے اور اغوا، اسراف اور تبذیر، فحاشی اور جنس پرستی، طبقاتی، فرقہ وارانہ اور علاقائی نزاعات، جیسے کتنے ہی روگ پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ایک سیلابِ بلا ہے جو ٹوٹ پڑا ہے۔

عزیز ساتھی! تمھارا کام یہ ہے کہ ذہن سے ساری پراگندہ خیالیوں کو جھٹک دو، اور کوئی ساتھی ملے تو بہت اچھا، نہ ملے تو تن تنہا نکل کھڑے ہو۔ کہیں سے رہنمائی اور مشورہ حاصل ہو تو بہت خوب، ورنہ قرآن و حدیث سے رہنمائی لو اور صحت مند دینی لٹریچر سے مشورہ طلب کرو۔ ایک ایک اور دو دو کر کے، سروسامان کے ساتھ بھی اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی خدا کی راہ میں قدم بڑھاؤ۔

ڈوبتوں کو بچاؤ۔ جو ابھی تک ڈوبنے سے بچے ہوئے ہیں اُن کو محفوظ بلند مقامات تک پہنچاؤ۔ جو محفوظ ہوگئے ہیں اُن کو رُوحانی غذا پہنچاؤ۔ جو بیمار ہیں ان کو دواخانۂ ایمان و اخلاق سے ادویہ فراہم کرو۔ جو وبازدگی کے خطرے میں ہیں اُن کو خوفِ خدا کے انجکشن لگاؤ۔

کام اتنا ہی نہیں، تمہاری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ سیلاب کی آفت سے بچ نکلنے والوں کو تم جہاد کے لیے تیار کرو۔ جہاد کے لیے اوّلاً صحیح اعتقاد کی ضرورت ہے، جہاد کے لیے اتحاد کی ضرورت ہے، اور جہاد کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اسلام میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آتا کہ فریضۂ جہاد ساقط ہو جائے۔ کبھی تلوار سے جہاد، کبھی زبان و قلم سے جہاد، کبھی جسم اور مال سے جہاد، اور کبھی دل و دماغ سے جہاد۔

اُٹھو، کتنے بھاری فرائض تم کو بلا رہے ہیں۔